© rasailojaraid.com

انیلہ ضمیر

عہد مغلیہ میں نصاب تعلیم و طریقۂ تعلیم

(۱۵۲۶ء ——— ۱۷۰۷ء)

عظیم مغلوں کے عہد کے طریقۂ تعلیم اور نصابِ تعلیم کی تاریخ تاریکی میں ہے۔ اس لیے نہ تو طریقۂ تعلیم کا ہو بہو نقشہ پیش کیا جانا ممکن ہے اور نہ اس دور کا نصاب کامل وثوق سے منظرِ عام پر لایا جا سکتا ہے۔ کیونکہ کوئی بھی عصری تصنیف اس مقصد کو پیشِ نظر رکھ کر نہیں لکھی گئی۔ اس عہد کے نصابِ تعلیم و طریقۂ تعلیم پر بحث یا کوئی مکمل و منظم خاکہ کسی بھی اہم عصر کتاب میں نہیں ملتا، بلکہ اس سلسلے میں ہماری معلومات سیاسی تواریخ کے چیدہ چیدہ واقعات اور علما و مشائخ کے حالات اور تذکروں کے حوالوں پر مشتمل ہیں جن کو بنیاد بنا کر زیرِ نظر موضوع پر کچھ لکھنے کی سعی کی جا سکتی ہے۔

ابتدائی اور ثانوی تعلیم

ہر دور میں دوسرے اسلامی ممالک کی طرح ہندوستان میں بھی اُس عہد میں قرآن مجید کا پڑھایا جانا مسلمان بچوں کی تعلیم کا پہلا قدم تھا،[۱] جس کا پہلا مرحلہ قرآنِ کریم کی حروف شناسی تھی۔[۲] قرآن شریف بچوں کو مساجد کے علاوہ مدارس میں بھی پڑھایا جاتا تھا، جیسے عبدالحق محدث دہلوی رح نے لکھا ہے کہ مدارس میں معلم صاحبان بچوں کو رٹا کر پڑھاتے تھے۔[۳] اس کے علاوہ سخن شناس والدین گھر پر بھی اس کی تعلیم دیتے۔ عبدالحق محدث دہلوی رح نے

---

[۱] S.M. Jaffar, Education in Muslim India, Peshawar, 1936 pp.20-21

[۲] مناظر احسن گیلانی، ہندوستان میں مسلمانوں کا نظامِ تعلیم و تربیت، جلد دوم (حیدر آباد دکن: ندوۃ المصنفین، ۱۹۴۳ء) ص ۳۱۸

[۳] عبدالحق محدث دہلوی رح، اخبار الاخیار، ترجمہ، اقبال الدین احمد (کراچی ادارالاشاعت ۱۹۶۳ء) ص ۵۱۰

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بھی اپنے والدِ محترم سے قرآن حکیم پڑھا تھا۔ اُنھوں نے اپنی تصنیف " اخبار الاخیار" کے آخر میں اپنے ابتدائی حالات قلم بند کرتے ہوئے والد صاحب سے قرآن پاک پڑھنے کے طریقے کا ذکر کیا ہے جو عام اور مروجہ طریقے سے مختلف تھا۔ لکھتے ہیں۔

" میں نے بغیر حروف تہجی پڑھے پہلے پہل دو تین سپارے قرآن کریم کے اس طرح پڑھے کہ والد ماجد مجھے ایک ایک سبق لکھ کر دیتے اور میں پڑھتا جاتا۔ اس کے بعد ان کی تربیت و شفقت کا یہ اثر ہوا کہ روزانہ جتنا قرآن کریم پڑھتا وہ ان کو سنا دیتا۔ چنانچہ اس طرح دو تین مہینے کے اندر میں نے پورا قرآن کریم پڑھ لیا"۔ [۵۴]

بچوں کی ابتدائی تعلیم کے ضمن میں رسم مکتب یا رسم بسم اللہ قابلِ ذکر ہے۔ شاہی ایوانوں میں اس تقریب کو خاص اہتمام سے منایا جاتا۔ جب شہزادے کی عمر چار سال چار ماہ اور چار روز کی ہوجاتی تو یہ رسم ادا کی جاتی جس کا مقصد یہ اعلان کرنا تھا کہ اب سلسلۂ تعلیم باقاعدگی سے شروع کر دیا گیا ہے۔ اس موقعے پر قرآن پاک کی رحل شہزادے کی گود میں رکھی جاتی۔ [۵۵] وہ اپنی زندگی کا پہلا سبق پڑھتا، اس کے اتالیق کا تقرر کیا جاتا اور اس خوشی میں ایک بڑا جشن کر کے لوگوں پر سخاوت کے دروازے کھول دیے جاتے۔ [۵۶] ہمایوں، اکبر، جہانگیر اور شاہ جہاں کی رسمِ مکتب کا ذکر ہم عصر تواریخ میں ملتا ہے۔ شاہی طبقے کی طرح امرا اور اعلیٰ طبقے میں بھی یہ رسم رائج ہوچکی تھی [۵۷] کیونکہ سماجی رسم ورواج اور روایات کی رو کا مرکز یہی حکمران طبقہ تھا۔ امرا رہن سہن کے معاملے میں نمونہ سمجھے جاتے تھے اور لوگ لاشعوری طور پر ان کی نقل کرتے تھے۔ امرا کی اقدار عام لوگوں کی اقدار بن جاتی تھیں۔ اس لیے یہ

۵۴۔ عبدالحق محدث دہلویؒ ، اخبار الاخیار ، ص ۵۱۰

۵۵۔ محمد صالح کمبوہ ، شاہ جہاں نامہ ، تلخیص و ترتیب ، ممتاز لیاقت ، جلد اول (لاہور : سنگ میل پبلی کیشنز ، ۱۹۸۲ء) ص ۲۶

۵۶۔ نورالدین محمد جہانگیر ، تزک جہانگیری ، ترجمہ ، احمد علی رام پوری (لاہور : سنگ میل پبلی کیشنز ۱۹۷۷ء) ص ۲۰

۵۷۔ Keay, Ancient Indian Education, quoted in S. M. Jaffar's Education in Muslim India, pp.152

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

رسم معاشرے کے مسلمان طبقے میں بھی پھیل گئی۔ کے۔ایم۔اشرف اس رسم کے بارے میں لکھتے ہیں کہ بچے کی تعلیم کو خاص اہمیت دی جاتی تھی۔ جب بچے کو پہلی مرتبہ سکول داخل کیا جاتا یا کسی استاد کے سپرد کیا جاتا تو دلکش رسوم کا اہتمام ہوتا۔ چار سال، چار ماہ اور چار روز کی عمر کو پہنچنے پر رسم مکتب یا بسم اللہ خوانی کی رسم ادا کی جاتی بچہ اپنے استاد سے پہلا سبق پڑھتا اور اس نیک ساعت کو کوئی ماہر منجم طے کرتا[۵۸] اگرچہ یہ رسم عزیز و اقارب کے مل بیٹھنے کا ایک بہانہ بھی ہوسکتی ہے مگر حقیقتاً اس کی تہہ میں علم سے وابستگی کا وہ جذبہ کارفرما تھا جس کا سبق دینِ اسلام نے دیا اور جس کا مقصد بچے کو یہ باور کراتا تھا کہ اس دن اور اس تقریب کی اہمیت کی طرح حصول علم بھی اس کی زندگی کا اہم ترین مقصد ہے۔

ابتدائی تعلیم کے سلسلے میں مساجد اور مکاتب مسلم طلبا کے حصول تعلیم کا پہلا زینہ تھے جیسا کہ مکتب کے لفظ سے عیاں ہے، یہاں لکھنا پڑھنا سکھایا جاتا تھا۔ چونکہ مسلمانوں کی عام بول چال کی زبان فارسی تھی اور اسی کو سرکاری زبان کا درجہ بھی حاصل تھا، بعد ازاں اکبر نے تمام دفتری کارروائی بھی فارسی میں کرنے کا حکم صادر کر دیا تھا، اس لیے پرائمری اور ثانوی تعلیم میں فارسی ہی ذریعۂ تعلیم تھی اور مکاتب میں بچوں کو ابتدائی حساب کے ساتھ فارسی لکھنا پڑھنا سکھایا جاتا تھا[۵۹]

اکبر کے دورِ حکومت میں بچوں کی ابتدائی تعلیم کے طریقۂ کار میں کامیاب اصلاحی کوششیں کی گئیں اور خاص طور پر مدتِ تدریس کو مختصر کر دیا گیا۔ اس سے پہلے کے طریقۂ تعلیم کے بارے میں ابوالفضل کا بیان ہے کہ لڑکے سالہا سال مکتب میں وقت گزارتے ہیں اور اس طویل مدت میں صرف حروف مفردات اور چند اعراب کی تعلیم حاصل کرتے ہیں اور بچوں کی عمر کا ایک بڑا حصہ صرف و ضائع ہو جاتا ہے[۶۰] مگر فارسی حروف

---

۵۸ K.M. Ashraf, Life and Conditions of the People of Hindustan (Bombay: Asiatic Society of Bengal, 1935) pp.249

۵۹ S. M. Jaffar, Education in Muslim India, pp.21.

۶۰ ابوالفضل، آئین اکبری، ترجمہ، محمد فدا علی طالب، جلد اول (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز (س ن) ص ۲۱۷

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بچوں کو ذہن نشین کروانا آسان نہیں، خصوصاً ہندو بچوں کے لیے تو اور بھی دشوار تھا کیونکہ ان کی تمام تحریریں بائیں سے داہنے جانب لکھی جاتی ہیں، چنانچہ حروف آموزی کے طریقے کو سہل بنانے کی کوشش کی گئی۔ ابوالفضل نے اس نئے طریقہ تعلیم کے متعلق جو مکاتب میں متعارف کرایا گیا تفصیلاً تحریر کیا ہے۔

"جہاں پناہ نے حکم دیا کہ بیشتر لڑکوں کو حروف تہجی کا لکھنا سکھایا جائے اور اس امر کی کوشش کی جائے کہ بچے ہر حرف کی مختلف اشکال اور کشش سے بخوبی واقف ہو جائیں۔ اس طرح لڑکے ابتدا میں فقط حرف کی شکل اور اس کا نام یاد کریں اور دو روز میں تمام حروف تہجی کو ختم کر کے حروف کے جوڑ پیوند کو لکھنا اور پڑھنا سیکھیں۔

"ایک ہفتہ اس پر عمل کرنے کے بعد طالب علم کو اس قدر استعداد و واقفیت ہو جاتی ہے کہ وہ کسی نثر یا نظم کا ایک حصہ جو خدا کی حمد و ثنا اور حکمت و نصیحت کے متعلق ہوتا ہے یاد کر لیتا ہے۔"

"اس امر کی بے حد کوشش کی جاتی ہے کہ بچہ خود حروف کا جوڑ بند پہچانے اور اس کو ملا کر الفاظ کو نکالے اور بخوبی ہجے کر سکے، ان امور میں استاد کم مدد دیتا ہے۔ چند روز ایک مصرع یا ایک مقولہ اس طرح پڑھایا اور یاد کرایا جاتا ہے اور لڑکا قلیل مدت میں رواں پڑھنے لگتا ہے۔ استاد ہر روز پانچ امور پر توجہ رکھتا اور ان کی نگہداشت کرتا ہے۔

(۱) حروف کی شناخت (۲) الفاظ کے معانی (۳) مصرع (۴) شعر (۵) آموختہ۔"[۱۱]

ابتدائی تعلیم کے طریقۂ کار میں یہ تبدیلی جدید طریقوں کے مشابہ تھی، مثلاً بچے کا استاد کی مدد کے بغیر خود ہجے کرنا اور حروف کو جوڑنے کا سلیقہ پیدا کرنا حقیقتاً اس امر کی کوشش تھی کہ رٹنے کی بجائے بچہ خود اپنی ذہنی صلاحیتوں کو بروئے کار لائے، یہی وجہ تھی کہ وہ ہفتے بھر میں اس پر عبور حاصل کر لیتا تھا اور جلد ہی چھوٹے جملے، اشعار اور طویل عبارتیں پڑھنے اور لکھنے کا ماہر ہو جاتا تھا۔ کیونکہ مندرجہ بالا صرف پانچ امور میں مسلم بچے کی اصلاح یا نگہداشت سے بچے میں خود اعتمادی پیدا ہو جاتی۔ اس کے علاوہ اس طریقۂ تعلیم کی ایک خوبی یہ تھی کہ زبانی تعلیم کی بجائے شروع ہی سے بچے کے لکھنے پر توجہ دی جاتی جس کے بہتر نتائج برآمد ہوئے۔

۱۱۔ ابوالفضل، آئینِ اکبری، جلد اول، ص ۲۱۷ ـ ۲۱۸

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہندو طریقہ تعلیم میں لکھنے پر کافی زور دیا جاتا تھا اور اکبر نے غالباً پاٹ شالاؤں میں بچوں کی جلد ترقی کو دیکھتے ہوئے مکاتب میں اس قاعدے کو عمل میں لانا بہتر سمجھا۔[۱۲] اس نئے طریقۂ تعلیم کی کامیابی یہ تھی کہ ایک سال کا نصاب ایک مہینے میں ختم ہوگیا اور لوگ حیرت زدہ ہوئے۔ ابوالفضل کے بیان سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ طریقۂ تعلیم صرف سرکاری مکاتب میں رائج ہوا۔

شہروں کے علاوہ قصبات میں بھی اس طرح کے فارسی مکاتب قائم تھے جن کا ذکر کرتے ہوئے سید سلیمان ندوی نے یہاں پڑھائی جانے والی کتابوں اور نصاب کا تذکرہ کیا ہے اور ان مکاتب کو موجودہ زمانے کے سکول کا درجہ دیا ہے۔ لکھتے ہیں۔

> "قصبوں میں فارسی کے مکتب ہوتے تھے۔ ہندو اور زیادہ تر مسلمان "میاں جی" پڑھاتے تھے۔ فارسی کی ابتدائی تعلیم میں بول چال، خط و کتابت اور اخلاقی حکایات کی کتابیں داخل ہوتی تھیں۔ ہندو مسلمان لڑکے ایک ساتھ نہایت میل جول اور یک جہتی کے ساتھ پڑھتے تھے۔ گلستان، بوستان، یوسف زلیخا، انشائے خلیفہ، بہارِ دانش، اخلاقِ ناصری، انوار سہیلی، سکندر نامہ، شاہ نامہ وغیرہ کتابیں داخلِ درس تھیں۔ خوش خطی اور فارسی نویسی سکھائی جاتی تھی۔ فرامین اور دیگر مراسلات سرکاری اور خطِ شکستہ کے پڑھنے کی عادت پیدا کرنے کے لیے پرانے لمبے خطوط کا ایک طومار "میاں جی" اپنے پاس رکھتے تھے جس میں سو دو سو خط لمبے جڑے ہوتے تھے۔ مکتب کے طالبِ علم اُن کو پڑھتے تھے۔ اس کو سکول کی تعلیم سمجھنا چاہیے۔ اس کے بعد یا تو لڑکے نوکری کر لیتے یا تکمیل کے لیے مشہور اساتذہ کی خدمت میں بڑے بڑے شہروں میں چلے جاتے تھے۔"[۱۳]

گویا جن طلبا کا ارادہ سرکاری ملازمت اختیار کرنے کا یا بطور منشی اور خوش نویس بھرتی ہونے کا ہوتا، ان

۱۲۔ سعید احمد رفیق، اسلامی نظامِ تعلیم (کراچی: اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ، ۱۹۵۶ء) ص ۱۵۹

۱۳۔ سید سلیمان ندوی، ہندوؤں کی تعلیم مسلمانوں کے عہد میں (کراچی: اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ، ۱۹۵۸ء) ص ۵۶-۵۵

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے لیے اسی قدر تعلیم ضروری خیال کی جاتی تھی یہی وجہ ہے کہ یہاں انشا آموزی اور منشیانہ ضرورتوں کا زیادہ خیال رکھا جاتا تھا۔ اس کے بعد جو طلبا فارسی علم و ادب کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے خواہش مند ہوتے وہ فارسی لسانیات کے ماہرین سے استفادہ کرنے کے لیے اُن کے گھروں اور درس گاہوں کا رُخ کرتے۔

ان درس گاہوں میں فارسی کا نصاب کیا تھا؟ اس بارے میں فارسی کی متداول تاریخیں کچھ روشنی نہیں ڈالتیں، مگر ایک فارسی تصنیف "خلاصۃ المکاتب" جسے ایک ہندو مصنف نے ۱۱۰۰ھ میں تحریر کیا، اس کے ایک باب "بیان خواتا نیدن اطفال" میں مصنف نے تفصیل کے ساتھ ابتدا سے انتہا تک درجہ بدرجہ فارسی کتابوں کے نام لکھے ہیں۔ اگرچہ اس کتاب کو بھی منشی گیری یا منشیانہ ضرورتوں کے لیے تحریر کیا گیا مگر متذکرہ باب میں مصنف نے اپنی رائے کے مطابق جس ترتیب کے ساتھ جن کتابوں کے نام لیے ہیں اس سے اتنا ضرور ثابت ہوتا ہے کہ گیارھویں صدی ہجری میں یہ کتابیں پڑھائی جاتی تھیں یا ان کا ایک بڑا حصہ داخلِ نصابِ درس تھا[۱۴۷] چنانچہ اس فارسی نصاب کو یہاں نقل کیا جاتا ہے جو چھوٹے بچوں کی ابتدائی تعلیم کے بعد کے مرحلے کے لیے لکھا گیا ہے:

> "اس کے بعد حضرت شیخ مصلح الدینؒ جو شیخ سعدی شیرازی کے نام سے مشہور ہیں اور جو حقیقت و مجاز کے باغ کے بلبل اور شیراز کے گلستان کے عندلیب ہیں، اُن کی کتابیں پڑھ، عقل کے چراغ میں تیل ڈال، اس کے بعد یہ کتابیں درجہ بدرجہ پڑھ اور پڑھے ہوئے کو فراغت کے وقت اور چھٹیوں کے دنوں میں یاد کر، تاکہ مشکل عبارتوں کے مفہوم کو بار بار پڑھا جائے اور نہ بھلایا جائے۔"

اس کے بعد مصنف نے بالترتیب پانچ مضامین کی کتابوں کا تذکرہ کیا ہے جو درج ذیل ہیں۔

۱۔ ادب و انشا: بدائع الانشا مشہور بہ انشائے یوسفی، مرقوماتِ ملّا جامی و ملّا منیر، گلدستہ شیخ عنایت اللہ منشی شاہ جہاں، بہارِ سخن از شیخ محمد صالح، مکتوباتِ ابوالفضل، رقعاتِ عالم گیری، مکتوباتِ ملّا منیر، منشیاتِ رشید او ملّا طغرا، کتاب یلادتی مترجم شیخ فیضی، کارنامہ لعل چند

---

۱۴۷ ابوالحسنات ندوی، ہندوستان کی قدیم اسلامی درس گاہیں (لاہور: مکتبہ خاور، ۱۹۷۹ء) ص ۱۲۱ - ۱۱۹

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۲۔ نظم و شعر: یوسف زلیخا، تحفۃ الاحرار، نسخۃ الابرار از ملّا جامی، سکندر نامہ، مخزن اسرار ہفت پیکر، شیریں خسرو، لیلیٰ مجنوں از مولانا نظامی، قران السعدین، مطلع الانوار، اعجاز خسروی از امیر خسرو دہلوی، دیوان شمس تبریز، دیوان ظہیر فاریابی، دیوان سعدی، دیوان حافظ، قصائد انوری، قصائد خاقانی، قصائد عرفی، دیوان فیضی، دیوان بدر چاچ، دیوان صائب۔

۳۔ افسانہ و حکایت: نسخہ طوطی نامہ بخشی، انوار سہیلی تصنیف مولانا حسین واعظ کاشفی، عیار دانش از ابوالفضل، بہار دانش از شیخ عنایت اللہ۔

۴۔ تاریخ: شاہنامہ فردوسی، ظفر نامہ از شرف الدین علی ترمذی متضمن فتوحات تیموری۔ اکبر نامہ، اقبال نامہ جہانگیری، تاریخ فیروز شاہی، رزم نامہ ترجمہ مہا بھارت۔

۵۔ فن اخلاق: اخلاق ناصری، اخلاق جلالی، مکاتبات سید شاہ شرف الدین احمد یحییٰ امیری، نزہۃ الارواح، مثنوی مولوی معنوی، حدیقہ حکیم سنائی۔[۱۵]

مندرجہ بالا نصاب اُن طلباء کے لیے تھا جو ابتدائی تعلیم کے بعد فارسی کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا چاہیے اور جن کا مقصد فارسی شعر و سخن میں مہارت حاصل کرنا ہوتا۔ مگر بعض طلبا مکاتب سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد تمام مروّجہ علوم کی تکمیل کرنا پسند کرتے تھے، جس کا اہتمام عموماً سرکاری مدارس کرتے تھے اور انہی مدارس کا نصاب تعلیم ابوالفضل نے آئین اکبری میں تحریر کیا ہے۔ سید سلیمان ندوی نے اسے کالج کی تعلیم قرار دیا ہے۔[۱۶] اس کا نصاب اس طرح سے ہے۔

"اخلاق، حساب، سیاق، زراعت، اقلیدس، ہندسہ، نجوم، رمل، تدبیر منزل، سیاست مدن، طب، منطق، طبیعیات، ریاضی اور دُنیا کی تاریخ۔ سنسکرت کے طلبا کے لیے بیاکرن بنائیے، بیدانت اور پاتنجل کی تعلیم ضروری قرار دی گئی۔"

ابوالفضل نے اس کے متعلق مزید کہا ہے کہ ہر طالب علم کے لیے موجود ضروریات و علوم کی تعلیم حاصل کرنا فرض کیا گیا ہے اور ان قواعد سے مدرسوں میں علوم و فنون کو فروغ حاصل ہوا۔[۱۷]

---

[۱۵] ابوالحسنات ندوی، ہندوستان کی قدیم اسلامی درس گاہیں، ص ۱۲۴ - ۱۲۲

[۱۶] سید سلیمان ندوی، ہندوؤں کی تعلیم مسلمانوں کے عہد میں، ص ۵۶

[۱۷] ابوالفضل، آئین اکبری، جلد اوّل، ص ۴۱۸

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

عہد اکبری میں سرکاری طور پر جو نصابِ تعلیم جاری کیا گیا، اس کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اکبر نے مدارس میں عقلی علوم اور فنی مضامین کی تعلیم کو فروغ دینے کی کوشش کی۔ ہندوستان میں مسلم عہد کی تاریخ میں پہلی مرتبہ سرکاری طور پر وقت کی ضرورتوں کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے طلبا کو مختلف النوع علوم کی تدریس کی طرف راغب کیا گیا۔ حساب، جیومیٹری، ریاضی، ہندسہ، طبیعی اور منطق جیسے عقلی علوم اور زراعت اور طب جیسے عملی اور فنی مضامین کو ادبی اور نظریاتی علوم پر ترجیح دی گئی۔ اس کے علاوہ "تاریخ عالم" اور "رموز سیاست" کا شامل نصاب ہونا خاص اہمیت کا حامل ہے۔ "آرتھ شاستر" کے مطابق انتظامیہ کے سلیقے تو صرف شاہی خاندان کے شہزادوں کو سکھانے چاہئیں، مگر عہدِ اکبری میں یہ مضمون صرف شہزادوں تک محدود نہ رکھا گیا بلکہ مستقبل میں اچھے گورنر اور قابل منتظم پیدا کرنے کے لیے اسے بھی شاملِ نصابِ درس کیا گیا۔[۱۵] یہ بات اس امر کی غماز ہے کہ حکمراں طبقے کا دائرۂ نظر وسیع تھا۔ ہندوؤں کی تعلیمی ضرورتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ان کے لیے سنسکرت کی کتابوں کو بھی نصاب کا حصہ بنا کر فراخ دلی کا مظاہرہ کیا گیا۔

اس نصاب کے سلسلے میں ہمیں اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ یہ نصابِ تعلیم صرف سرکاری مدارس سے متعلق تھا اور اس کے تحت صرف وہی طلبا تعلیم حاصل کرتے تھے جو ان مدارس سے وابستہ تھے، ورنہ ذاتی طور پر قائم کیے گئے مدارس اور انفرادی درس گاہوں میں جو اس زمانے میں تعلیم کا اصل مرکز و محور تھے، نصابِ تعلیم میں کسی قسم کی تبدیلی نہ ہوئی۔ یہ نصابِ درس جو آیندہ صفحات میں اعلیٰ تعلیم کے ضمن میں بیان کیا جائے گا مضامین کے اعتبار سے بعینہٖ وہی تھا جو عہدِ سلاطین میں رائج رہا اور اس نصاب میں چند درسی کتابوں کے بدل جانے سے کوئی تبدیلی اور ردوبدل نہ ہوا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ حکومت نے تعلیم کے شعبے کو مکمل طور پر آزاد رکھا تھا اور نظامِ تعلیم سے متعلق کوئی واضح حکمتِ عملی مرتب نہ کی گئی تھی۔ نہ باضابطہ تدریسی مراحل کے تحت درجہ بدرجہ کوئی نصابِ تعلیم متعین کیا گیا تھا، جس کا اطلاق تمام مملکتِ محروسہ میں یکساں طور پر ہوتا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ نصابِ تعلیم جسے ابوالفضل نے آئینِ اکبری میں تحریر کیا ہے بڑے محدود پیمانے پر شاملِ درس رہا اور اس سے وہ تعلیمی نتائج برآمد نہ ہو سکے جن کی توقع اس قسم کے نصاب سے کی جا سکتی تھی۔

---

۱۵ S. M. Jaffar, Education in Muslim India, pp.22.

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اعلیٰ تعلیم

عہد سلاطین کی طرح مغلیہ دور میں بھی اعلیٰ تعلیم باضابطہ عربی زبان سیکھنے اور اسلامی علوم پر عبور حاصل کرنے کا نام تھی۔ چنانچہ اس دور میں بھی درس گاہوں میں وہی علوم و فنون پڑھائے جاتے تھے جن کی تحصیل سابقہ عہد میں ضروری سمجھی گئی۔ یہ الگ بات ہے کہ ان علوم سے متعلق درسی کتابوں میں کسی حد تک تبدیلی ہوتی رہی یا پھر چند مضامین کو زیادہ انہماک کے ساتھ پڑھایا جانے لگا مگر بابر، ہمایوں اور اکبر کے ابتدائی دور میں درسی کتابیں تقریباً وہی رہیں جو سلاطین کے آخری عہد میں پڑھائی جانے لگی تھیں۔

عبدالحق محدث دہلوی نے جن کی ولادت ۱۵۵۱ء میں دہلی میں ہوئی، اکبر کے ابتدائی عہد میں اپنی طالب علمی کا زمانہ گزارا۔ اُنھوں نے اپنی تصنیف "اخبار الاخیار" کے آخر میں اپنے ابتدائی حالات درج کیے ہیں اور ترتیب وار ان کتابوں کا ذکر کیا ہے جو ان کے زیر مطالعہ رہیں لکھتے ہیں کہ "بچپن سے لے کر قرآن کریم ختم کرنے تک اور اس کے بعد میزان الصرف سے لے کر کافیہ کی تعلیم والدِ بزرگوار سے حاصل کی۔ علم نحو میں کافیہ، لب الالباب اور ارشاد کا مطالعہ کیا۔ بارہ تیرہ سال کی عمر میں شرح شمسیہ اور شرح عقائد نسفی پڑھی اور پندرہ سال کی عمر میں مختصر معانی اور مطول ختم کی اور لوگوں کے خیال میں بیس سال کی عمر میں فلسفہ، ادب اور فقہ و حدیث وغیرہ پڑھ چکا تھا۔"[۱۹] اس میں علمِ صرف و نحو، بلاغت اور منطق سے متعلق وہی کتابیں ہیں جو سلاطین کے دور میں رائج ہو چکی تھیں۔ البتہ علمِ کلام میں شرح صحائف کی بجائے اُنھوں نے شرح عقائد نسفی پڑھی جو عہد مغلیہ میں مستقل طور پر شاملِ درس ہوئی۔ محدث دہلوی کے حالات سے اس امر کی نشان دہی ہوتی ہے کہ مغلیہ عہد میں اکبر کے ابتدائی دور تک درسی کتابوں میں کسی واضح تبدیلی کا رجحان نہیں ملتا۔

مغلوں میں اکبر کا عہد نصابِ تعلیم میں نئے اضافوں کا موجب بنا۔ سکندر لودھی کے زمانے میں تعلیم اور نصابِ تعلیم میں معقولات سے متعلق جو انقلابی قدم اُٹھایا گیا اس کا اعادہ اس عہد میں ہوا۔ اس مرتبہ تعلیمی انقلاب لانے والی شخصیت شاہ فتح اللہ شیرازی کی تھی جن کی گوناگوں کوششوں سے عقلی علوم سے دلچسپی کے اس رجحان کو اس قدر ترقی ہوئی کہ بعد ازاں ملّا نظام الدین نے درسِ نظامیہ میں اسے واضح اور مستقل صورت میں اپنایا۔ ان ہی خیالات کا اظہار شاہ سلیمان سجادہ نشین پھلواری (بہار) نے "الندوہ" کے ایک

۱۹۔ عبدالحق محدث دہلوی، اخبار الاخیار، ص ۵۱۱ - ۵۱۰

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

شمار سے میں کیا ہے۔

" اسی کے قریب زمانے میں ملا فتح اللہ شیرازی کے درس و تدریس کا غلغلہ بلند ہوا اور ہندوستانی علما عموماً اور اہل پورب خصوصاً انہی کے اندازِ تعلیم پر چلنے لگے۔ ان کے وقت سے گویا ایک جدید نصابِ تعلیم قائم ہوا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میرا مقصود فقط یہ ہے کہ درسِ نظامیہ جس کا ہیولیٰ فتح اللہ شیرازی سے ظہور میں آیا اور صورتِ نوعیہ اس کی روپ بدلا کی، یہاں تک کہ درس کا مروجہ و موجودہ حال پر استقرار ہوا۔"[۲۰]

میر فتح اللہ شیرازی عہدِ اکبری میں ایران سے نقلِ مکانی کر کے ہندوستان تشریف لائے۔ جب اکبر کو یہ خبر پہنچی کہ شیراز کے ایک فلسفی عالم غیاث منصور کا ایک شاگرد بیجاپور آیا ہوا ہے تو ۹۹۰ھ میں بادشاہ نے فتح اللہ شیرازی کو عادل خان حاکمِ دکن کے پاس سے فرمان بھیج کر بلایا۔ پہلے اسے صدارت کا منصب عطا کیا جس سے ملکی تعلیمات اور مدرسین کی سرپرستی براہِ راست اس کے کنٹرول میں آگئی۔ اس کے بعد وزارت کے عہدے پر راجہ ٹوڈرمل کا شریکِ کار بنا دیا[۲۱] اور عضد الملک کے خطاب سے نوازا[۲۲] اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ میر فتح اللہ شیرازی دربارِ اکبری کی ایک موثر اور با اقتدار شخصیت تھے اور جہاں تک اُن کی علمی قابلیت کا تعلق ہے، اس کا اعتراف عبدالقادر بدایونی نے بھی کیا ہے، لکھتے ہیں:

" تمام علومِ عقلی جیسے حکمت (فلسفہ) ہیئت، ہندسہ، نجوم و رمل، حساب، طلسمات و نیرنجات، جرِ اثقال وغیرہ کے عالم و ماہر تھے۔ اس فن میں ایسی مہارت و دست رس تھی کہ اگر بادشاہ تیار ہو جاتا تو وہ رصدگاہ تیار کر دیتے۔ علوم عقلی کی طرح عربی، علوم حدیث، تفسیر اور کلام میں بھی بڑی مہارت حاصل تھی۔"[۲۳]

---

۲۰ شیخ محمد اکرام۔ رودِ کوثر (لاہور، ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، ۱۹۸۲ء) ص ۱۶۲

۲۱ عبدالقادر بدایونی، منتخب التواریخ، ترجمہ، محمود احمد فاروقی، جلد دوم۔ ص ۵۰۶۔ ۵۰۵

۲۲ ایضاً، جلد سوم، ص ۶۴۶

۲۳ ایضاً " ، ص ۶۴۵

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ فتح اللہ شیرازی جو خود عقلی علوم کے ماہر عالم تھے اپنے ساتھ ایرانی عقلیت پسندی کی تحریک بھی ہندوستان لائے اور یہاں کے معیارِ فضیلت کو پہلے سے زیادہ بلند کرنے کے لیے سابق نصابِ درس میں جدید اضافے کیے، جسے یہاں کی متغیر علمی فضا نے قبول کیا۔ میر غلام علی آزاد نے بھی مندرجہ ذیل عبارت میں اس کا اعتراف کیا ہے۔

"میر فتح اللہ شیرازی، ایران کے علمائے متاخرین مثلاً دوانی، میر صدر الدین، میر غیاث الدین منصور اور مرزا جان کی تصانیف لے کر ہندوستان آئے اور درس و تدریس کا حلقہ قائم کیا جس سے بہت سے لوگوں نے استفادہ کیا اور جس سے اس عہد میں معقولات کا دوسرا دور شروع ہوا۔"[۲۴]

میر غلام علی آزاد، میر فتح اللہ شیرازی کی تصانیف کے متعلق لکھتے ہیں:

"ان کی تصانیف میں سے تکملہ حاشیہ علامہ دوانی (ملا جلال) ہے جو تہذیب المنطق پر ہے اور اُن کا یہ "حاشیہ" حاشیہ مذکورہ پر مستند ہے۔"[۲۵]

گویا ایک طرف تو آپ دوانی، صدر شیرازی، مرزا جان کی کتابوں کو نصابِ درس میں شامل کر رہے ہیں تو دوسری طرف شرح ملا جلال پر حاشیہ لکھ کر اسے بطور ایک مدرس مستحکم حیثیت دے رہے ہیں اور صرف یہی نہیں بلکہ ملا عبد القادر بدایونی کے بیان کے مطابق:

"وزارت کے ساتھ ساتھ وہ امرائے بچوں کو بھی بڑے شوق سے پڑھاتا رہتا تھا اور ہر روز بادشاہی مصاحبوں کے گھر پر اس غرض سے ضرور جایا کرتا تھا۔ پہلے تو اس نے حکیم ابو الفتح کے لڑکے کو، پھر شیخ ابو الفضل کے لڑکے کو پڑھایا۔ دوسرے امیروں کے بھی سات، سات، آٹھ، آٹھ برس تک کے بچوں کو الف ب پڑھنے لکھنے کی کوشش کراتا رہتا ہے۔"[۲۶]

اس طرح میر صاحب نے اپنے فلسفیانہ اور منطقیانہ مذاق کو امرا اور روسا کے گھر گھر پہنچا دیا اور

---

۲۴ میر غلام علی آزاد، ماثر الکرام، دفتر اول (حیدر آباد دکن: ۱۹۱۰ء) ص ۲۳۸

۲۵ ایضاً

۲۶ عبد القادر بدایونی، منتخب التواریخ، جلد دوم، ص ۵۰۶

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اُن کے مخصوص ادبی مذاق کے ساتھ ساتھ معقولات کا چسکا بھی لگا دیا۔ گویا اُنھوں نے عقلیت پسندی کی اس تحریک کو کامیاب بنانے کے لیے عملی کوششیں کیں۔

"اور یہی تھا ہمارے تعلیمی نصاب کا دوسرا انقلابی دور، یقیناً اس زمانے میں شرح تجدید قوشجی کے "حواشی قدیمہ وجدیدہ واجد" کا رواج اس ملک کے اربابِ تعلیم میں ہوا اور اس زمانے میں مرزا جانِ جاناں کے حواشی محاکمات و عضدیہ و قدیمہ وغیرہ نے یہاں مقبولیت حاصل کی۔ دوانی کی دونوں درسی کتابیں جو حال تک نصاب میں شریک تھیں اور پُرانے مدرسوں میں آج بھی ہیں یعنی مُلا جلال اور عقائد جلالی اس زمانے کی یادگاریں ہیں۔"[۲۷]

ملّا فتح اللہ شیرازی کی کوششوں سے نصابِ درس میں جن معقولاتی کتابوں کا اضافہ ہوا، اُس کا ایک حوالہ "دبستان المذہب" میں ایک اُستاد حکیم کامران شیرازی (متوفی ۱۰۵۰ھ) کے تذکرے سے ملتا ہے جو اس زمانے کی درسی کتابیں آگرہ میں پڑھاتا تھا اور فلسفہ ہی اس کا اصل موضوع تھا۔ اُس نے اپنے ایک شاگرد عبدالرسول کو جس ترتیب سے کتابیں پڑھائیں اسے صاحب دبستان المذہب نے نقل کیا ہے: "صرف و نحو کے بعد شرح شمسیہ (قطبی)، حسین بن معین الدین میبذی کی شرح ہدایت حکمت اور پھر امور عامہ کے بعد شرح حکمتہ العین اور پھر شرح تجدید با حواشی، طبیعیات، شرح اشارات اور الٰہیات شفا کی تعلیم دی۔"[۲۸]

شرح تجدید با حواشی تو وہی ہے جس کا ذکر حواشی قدیمہ وجدیدہ واجد کے نام سے اوپر آچکا ہے۔ اس کے علاوہ شرح ہدایت حکمت اور امور عامہ علی الترتیب فلسفہ اور علمِ کلام سے متعلق وہ عمدہ شرحیں ہیں جو بعد از اں درسِ نظامیہ کے نصاب کا مستقل حصّہ ہوئیں اور شرح شمسیہ اور شرح حکمتہ العین تو عہد سلاطین سے ہی داخل نصابِ درس ہوگئی تھیں۔

نصابِ درس میں معقولات کی کتابوں کے یہ نئے اضافے ان طالبِ علموں کے لیے اہم تھے جو منطق اور فلسفے جیسے عقلی علوم پر ماہرانہ عبور حاصل کرنا چاہتے تھے ورنہ دانشمندی کی سند کے لیے جو اعلیٰ تعلیم کا ابتدائی درجہ تھا ان کتابوں کا پڑھنا لازمی نہ سمجھا جاتا تھا۔[۲۹]

۲۷ے مناظر احسن گیلانی، ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت، جلد اوّل، ص ۱۹۷ - ۱۹۶

۲۸ے ایضاً ص ۱۹۶

۲۹ے ایضاً ص ۲۰۵

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میر فتح اللہ شیرازی نے یہاں کے نصابِ درس میں عقلیت پسندی کے جس رجحان کو ترقی دی اگرچہ اس کے ردِعمل میں معقولات سے وابستگی کی تحریک، اس تحریک کے شانہ بشانہ چلتی رہی جس کے علم بردار عبدالحق محدث دہلویؒ، مدرسہ رحیمیہ کے بانی شیخ عبدالرحیم اور پھر شاہ ولی اللہؒ قرار دیے جا سکتے ہیں، مگر اس حقیقت سے انکار نہیں کہ نصاب درس میں میر فتح اللہ کی ان انقلابی کوششوں کی علمی حلقوں میں بڑی حد تک پذیرائی ہوئی۔ اگرچہ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ عہد اکبری اور اس کے بعد بھی ہندوستان میں آزاد خیال ایرانیوں کی آمد اور نقل مکانی نے یہاں کی علمی فضا کو ایک نئے رنگ سے متعارف کرایا اور معقولات میں ان حضرات کی عالمانہ بصیرت نے میر صاحب کے کام کو آسان کر دیا۔ دوسری طرف درس و تدریس میں خود فتح اللہ شیرازی کی انتہائی دلچسپی نے معقولاتی ذوق کو عام کرنے میں مدد دی اور اُن کے شاگردوں نے اسے ہندوستان میں مستقل حیثیت سے اجاگر کیا۔

"درسِ نظامیہ ہندوستان کی علمی تاریخ اور علمی زبان کا سب سے زیادہ نمایاں لفظ ہے۔ ہندوستان میں آج کلکتہ سے پشاور تک جس قدر تعلیمی سلسلے پھیلے ہوئے ہیں، سب اس درس کی شاخیں ہیں۔ کوئی عالم، عالم نہیں جانا جا سکتا جب تک ثابت نہ ہو کہ اس نے اس طریقۂ درس کے موافق تعلیم حاصل کی ہے۔"[۳۰]

اس نصابِ درس کے بانی ملّا نظام الدین (المتوفی ۱۷۴۷ء) ہیں جن کے اس نصاب کی نمایاں ترین خصوصیت یہ ہے کہ "منطق اور فلسفہ کی کتابیں تمام علوم کی نسبت زیادہ ہیں"[۳۱] انہی ملا نظام الدین کا تعلیمی سلسلہ میر فتح اللہ شیرازی پر منتہی ہونا ثابت ہوتا ہے جو کہ اس کا بیّن ثبوت ہے کہ وہ میر فتح اللہ شیرازی کی معقولیت پسندی کی علمی تحریک سے براہ راست متاثر تھے اور جس کی غمازی خود ان کے مرتب کردہ درسِ نظامیہ سے ہوتی ہے۔ اس کا اندازہ مندرجہ ذیل علمی شجرے سے بھی ہو سکتا ہے۔

۳۰؎ سید سلیمان ندوی، (مرتبہ) مقالات شبلی، جلد ۳ (اعظم گڑھ دار المصنفین، ۱۹۵۵ء) ص ۱۰۴ - ۱۰۵

۳۱؎ ایضاً ص ۹۹

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

علمی شجرہ

میر فتح اللہ شیرازی

|

ملّا عبد السلام لاہوری

|

عبد السلام دیوی

|

ملّا دانیال چوراسی

|

قطب الدین سہالوی

ملا قطب الدین شمس آبادی — امان اللہ بنارسی

ملا نظام الدین صاحبِ درس نظامیہ

صاحب "تذکرہ علمائے ہند" نے اپنے عہد کے مشہور مدرس مولانا عبد السلام لاہوری کو شاگرد میر فتح اللہ شیرازی کے الفاظ سے متعارف کرایا ہے جن سے ملا عبد السلام دیوی نے حصول علم کیا۔[۳۲] انہی ملا عبد السلام دیوی سے ملّا دانیال چوراسی اور ان سے ملا قطب الدین سہالوی والدِ گرامی ملّا نظام الدین نے فیض حاصل کیا۔[۳۳]

ملّا قطب الدین سہالوی جنھوں نے عہدِ اورنگ زیب میں سہالی میں اپنی درس گاہ قائم کر رکھی تھی، معقولات کی طرف زیادہ رجحان رکھتے تھے[۳۴] خود ان کے خانوادے اور شاگردوں میں اس کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔ ۱۱۰۳ ہجری میں ملّا صاحب کی اچانک شہادت سے ملّا نظام الدین جو اس وقت تقریباً چودہ سال کے تھے اور ملا جامی تک تعلیم حاصل کر چکے تھے،[۳۵]

۳۲ے رحمان علی، تذکرہ علمائے ہند، ترجمہ، محمد ایوب قادری (کراچی؛ پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی، ۱۹۶۱ء) ص ۲۹۸

۳۳ے مناظر احسن گیلانی، ہندوستان میں مسلمانوں کا نظامِ تعلیم و تربیت، جلد اول، ص ۲۲۸ - ۲۲۹

۳۴ے سید سلیمان ندوی، (مرتبہ) مقالاتِ شبلی، جلد سوم، ص ۱۲۵

۳۵ے ایضاً ص ۱۱۴

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اپنے والد کے شاگردِ رشید امان اللہ بنارسی اور قطب الدین شمس آبادی سے مستفید ہوئے، گویا چند واسطوں سے ملّا نظام الدین کا تعلیمی رشتہ ملا فتح اللہ شیرازی سے قائم تھا۔ یہی وجہ ہے کہ چوبیس برس کی عمر میں فراغتِ تعلیم کے بعد جب آپ فرنگی محل میں مسندِ درس پر بیٹھے اور یہاں درسِ نظامیہ کا جو نصاب ترتیب دیا، اس میں فتح اللہ شیرازی کی انقلابی تحریک کو منظم و مربوط صورت میں مکمل طور پر اپنا لیا۔ فلسفہ، کلام اور منطق کو لازمی مضامین کی حیثیت سے متعارف کراتے ہوئے ان سے متعلق کثیر کتابیں نصاب درس میں شامل کیں۔ ادب کا حصّہ بہت کم کردیا اور فقہ کی ایسی کتابیں رکھیں جن میں معقولی استدلالی سے کام لیا گیا تھا، اس سے نصاب کی وہ ظاہر پرستی اور مذہب کا بے جا تعصب ختم ہوا جو سطحی فقہا کا خاصہ ہوتا ہے[۳۶]

حقیقتاً یہ میر فتح اللہ شیرازی کی عقلی تحریک کا براہِ راست اثر تھا جو عہد اورنگ زیب کے بعد منظم شکل میں ہمارے سامنے آیا، مگر اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا مشکل نہیں کہ خود مغلوں کے زمانے میں درس گاہوں میں معقولات پڑھنے پڑھانے کا رواج ترقی پاچکا تھا اور درس نظامیہ کی بیشتر کتابیں اس سے پہلے بھی مدرسوں میں پڑھائی جاتی تھیں۔ مثلاً علمِ کلام میں علامہ جلال الدین دوانی کی "شرح عقائد جلالی" اور سید شریف جرجانی کی "امور عامہ" منطق میں قاضی کمال الدین حسین میبذی کی "شرح ہدایت الحکمتہ" فتح اللہ شیرازی کی کوششوں ہی سے یہاں کے نصابِ درس کا حصّہ بنیں اور بعض نصابِ درسِ نظامیہ میں مستقل حیثیت دے دی گئی۔

عہد اکبری میں عقلیت پسندی کی اس تحریک کو جب پروان چڑھایا جارہا تھا تو ملا عبد القادر بدایونی نے اپنے مخصوص انداز میں اس رجحان پر چوٹ کرتے ہوئے لکھا کہ عربی پڑھنا عیب ہوگیا۔ فقہ، حدیث اور تفسیر پڑھنے والے مطعون کیے جانے لگے۔ نجوم، حکمت، طب، ریاضی، شعر، تاریخ اور افسانہ کی تحصیل فرض ہوگئی ہے[۳۷]

بدایونی نے اپنے مخصوص نظریات کی بنا پر اس مسئلے پر غور نہیں کیا کہ حکمت، طب، ریاضی، تاریخ جیسے علوم کسی بھی قوم کی شعوری ترقی کے لیے کس قدر ضروری ہیں۔ اُنھوں نے فقہ، حدیث اور تفسیر کے مطعون کیے جانے پر غم و غصّے کا اظہار کیا ہے مگر ان کا یہ بیان محل نظر ہے۔ کیونکہ ہندوستان میں مسلم نظامِ تعلیم کی یہ خصوصیت رہی ہے کہ یہاں حدیث، تفسیر اور فقہ جیسے نقلی و دینی علوم ہمیشہ اعلیٰ تعلیم کے نصاب کا بنیادی جزو رہے ہیں۔

---

۳۶ سید سلیمان ندوی، (مرتبہ) مقالاتِ شبلی، جلد سوم، ص ۱۰۰

۳۷ عبد القادر بدایونی، منتخب التواریخ، جلد دوم، ص ۵۰۰

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

خود عہدِ اکبری میں عبدالحق محدث دہلویؒ ایسی شخصیت موجود تھی جن کی اپنی درس گاہ قائم تھی، جہاں اُنھوں نے نصابِ تعلیم میں قرآن و حدیث کو سب سے مقدم قرار دے رکھا تھا ؎۳۸ جو ایک طرف درس و تدریس کے ذریعے علمِ حدیث کی اشاعت کر رہے تھے تو دوسری طرف تصنیف و تالیف سے دین کے خزانۂ علمی کو بڑھا رہے تھے۔ اس سلسلے میں حدیث کی کتاب "مشکوٰۃ" کی عربی شرح "لمعات" اور فارسی شرح "اشعۃ اللمعات" اور پھر ان کے بیٹے شیخ الاسلام نورالحقؒ کا "صحیح بخاری" کا فارسی ترجمہ قابلِ ذکر ہے ؎۳۹ یہ حضرات دینی علوم کو عربی سے فارسی میں منتقل کرکے مسلم عوام کے لیے تحصیلِ علم کو آسان بنا رہے تھے۔

غرض عقلیت پسندی کی تحریک کے ردِعمل میں نقلی علوم سے وابستگی کی تحریک بھی جاری تھی - عبدالحق محدث دہلویؒ کے بعد شاہ عبدالرحیم اور اُن کے خانوادے نے اس تحریک کی سرپرستی کی۔ "خدا تعالیٰ نے اس عمارت کا ایک اور سرپرست اُٹھا کھڑا کیا، جس کی بنیادیں جناب شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کے ہاتھوں نے ڈالی تھیں یعنی قدرت نے جناب شیخ عبدالرحیمؒ کو پیدا کیا۔ شیخ صاحب نے پرانی دہلی میں اس مقام پر ایک مدرسہ قائم کیا جو اب مہندیوں کے نام سے مشہور ہے اور اس کا نام مدرسۂ رحیمیہ رکھا جس میں علم نبوی کی تعلیم دینی شروع کی" ؎۴۰ مگر اس وقت تک علمی فضا میں اس قدر تبدیلی آچکی تھی کہ نقلی علوم کی سرپرستی کرنے والے حضرات بھی منطق و حکمت اور دوسرے عقلی علوم سے مکمل صرفِ نظر نہ کرسکتے تھے - اس کا اندازہ ہمیں اس نصابِ درس سے ہوتا ہے جسے خود شاہ ولی اللہؒ نے اپنے بزرگوار سے پڑھا۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ جب میں نے اپنی زندگی کے چودہ مرحلے طے کرکے پندرھویں میں قدم رکھا تو والدِ بزرگوار کی انتہا درجے کی شفقت و مہربانی کی وجہ سے تمام متعلقہ فنون حاصل کرچکا تھا ؎۴۱ شاہ ولی اللہؒ نے اپنی تصنیف "الجزء اللطیف" میں ان تمام درسیات کی فہرست درج کی ہے جو اُنھوں نے اپنے والدِ بزرگوار سے سبقاً سبقاً پڑھیں۔ اس کے مطالعے سے جہاں یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس عہد

؎۳۸ محمد علم الدین سالک، علمائے کرام، دینی مدرسے، نقوش لاہور نمبر (لاہور، ادارہ فروغِ اُردو، ۱۹۶۲ء)؛ ص ۴۵۸

؎۳۹ شیخ محمد اکرام، رودِ کوثر، ص ۳۸۱ - ۳۸۲

؎۴۰ محمد رحیم بخش، حیاتِ ولی (لاہور، المکتبۃ السلفیہ، ۱۹۵۵ء) ص ۲۱۴

؎۴۱ ایضاً ص ۴۰۹

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے دینی مدارس میں بھی عقلی علوم پورے اہتمام سے پڑھائے جاتے تھے، وہاں عہد مغلیہ کا مروجہ نصاب درس بھی ہماری نظروں کے سامنے آجاتا ہے۔ یہ نصاب شاہ عبدالرحیم کے مدرسے سے جو عہد اورنگ زیب میں جاری تھا غالباً ۱۱۱۲ھ میں قائم کیا گیا[۴۲] شاہ ولی اللہؒ کی طرح وہ دوسرے طلبا کو بھی انہی کتابوں کا درس دیتے تھے، اس طرح انہی درسیات کو بحیثیت مجموعی مغلوں کے عہد کا نصاب تصور کرنا چاہیے۔ اس کی تفصیل اس طرح سے ہے۔

علم نحو : کافیہ، شرح ملا جلالی

منطق : شرح شمیسہ، شرح مطالع

فلسفہ : شرح ہدایۃ الحکمۃ

کلام : شرح عقائد نسفی، شرح خیالی، شرح مواقف

فقہ : شرح وقایہ، ہدایہ کامل

اصول فقہ : حسامی، توضیح و تلویح

حدیث : مشکوٰۃ المصابیح کل، شمائل ترمذی کل، صحیح بخاری

تفسیر : بیضاوی، مدارک

تصوف و سلوک : عوارف اور رسائل نقشبندیہ، شرح رباعیات مولانا جامی، لوائح، مقدمہ شرح لمعات، مقدمہ نقد النصوص

بلاغت : مختصر و مطول

طب : موجز القانون

ہندسہ و حساب : بعض رسائل مختصرہ[۴۳]

عہد شاہجہانی کے جید عالم ملا عبدالحکیم سیالکوٹی ہیں جو ساٹھ سال تک درس و تدریس سے وابستہ رہے اور جنھوں نے علمائے قدیم کی تمام کتابوں پر حواشی لکھے اور جن کے بارے میں مولانا غلام علی آزاد بلگرامی کی رائے ہے کہ تمام درسی علوم میں ہندوستان کی سرزمین سے ان کا ہمسر پیدا نہیں ہوا۔ ان کی تصانیف میں حاشیہ تفسیر

۴۲ھ امداد صابری، دہلی کے قدیم مدارس و مدرس (دہلی: صابر اکیڈمی، ۱۹۷۷ء) ص ۱۱۴

۴۳ھ ابوالحسنات ندوی، ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں، ص ۹۶

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بیضاوی، حاشیہ مقدمات تلویح، حاشیہ مطول، حاشیہ شرح مواقف، حاشیہ خیالی، حاشیہ شرح شمسیہ، حاشیہ عقائد تفتازانی، حاشیہ عقائد ملا جلال دوانی، حواشی در کنار حکمۃ العین، حواشی ہدایۃ الحکمۃ شامل ہیں۔ چونکہ یہ اس زمانے کا رواج تھا کہ حاشیہ اور حواشی انہی کتب پر لکھا جاتا جو درس گاہوں میں مستعمل تھیں اور طلبا کی سہولت کے لیے اساتذہ ان کی تشریح کرتے یا اپنی رائے کا اظہار حاشیہ میں تحریر کرتے۔ ملا عبدالحکیم نے جن تصانیف اور شروح پر حواشی لکھے، یہ وہی ہیں جن کو بعد ازاں درس نظامیہ میں شامل کیا گیا یا جن کو شاہ ولی اللہؒ نے پڑھا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس سے پہلے دور شاہ جہانی میں بھی یہی کتابیں پڑھائی جاتی تھیں اور اسے مغلوں کے عہد کا نصاب تعلیم تصور کرنا چاہیے۔

عہد مغلیہ کے نصاب کا تحقیقی مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس نصاب کا مقصد طلبا میں ذہنی کاوش کا رجحان پیدا کرنا تھا، مثلاً علوم آلیہ جو صرف و نحو، معانی و بیان اور ادب پر مشتمل تھے ورزشی علوم کہے جا سکتے ہیں عموماً ان میں ابہام اور پیچیدگی کا عنصر اس قدر ہے کہ ہر مسئلہ غیر واضح ہے اور ہر کلیہ میں اعتراض و جواز کی کافی گنجائش موجود ہے۔ ان علوم کے پڑھائے جانے کا مقصد بھی یہی تھا کہ طلبا میں خود سوچنے اور تنقید کرنے اور مسائل کے دقیق پہلوؤں تک پہنچنے کی مشق پیدا ہو۔ اس طرح تلاش کر کے ایسی کتابیں شامل نصاب کی جاتیں جو تفصیل کی بجائے مجمل زیادہ ہوں اور عبارت بھی اتنی سلیس نہ ہو کہ بآسانی مطلب سمجھ میں آجائے۔ ان مشکل اور پیچیدہ کتابوں کو داخل نصاب کرنے کی غرض یہ تھی کہ دوسروں کی سوچی ہوئی باتیں سمجھنے کی قابلیت بھی طلبا میں پیدا کی جائے۔ انہی اغراض و مقاصد کو پورا کرنے کے لیے عہد سلاطین دہلی ہی سے تفسیر میں "کشاف"، اصول فقہ میں "بزدوی" اور فقہ میں "ہدایہ" کو شامل نصاب کیا گیا۔

کشاف، جو درحقیقت تفسیر کی کتاب تھی مگر اس کا امتیاز یہ تھا کہ ایک ایک فقرے کے مختلف پہلوؤں پر ادبی نقطۂ نظر سے ذہن کو منتقل کرانے کی مشق اگر کوئی بہم پہنچانا چاہے تو کشاف سے بہتر اس مشق کے لیے یہ واقعہ ہے کہ اسلامی ادبیات کے ذخیرے میں بمشکل کوئی دوسری کتاب مل سکتی تھی۔ [۴۴]

"بزدوی" کی مشکل پسندی کا اعتراف مولانا عبدالعلی بحرالعلوم نے "شرح مسلم الثبوت" کے دیباچے میں کیا ہے، لکھتے ہیں۔

---

[۴۴] مناظر احسن گیلانی، ہندوستان کے مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت، جلد اول، ص ۳۰۸

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

"فخر الاسلام (علامہ علی ابوالحسن البزدوی) کی عبارتوں کی مثال ایسی ہی ہے جیسے چٹانوں میں کسی نے جوہر جوڑ دیے ہوں یا ایسے پتے ہیں جن میں پھول چھپے ہوئے ہیں۔ ذہن و ذکاوت والے ان عبارتوں سے معانی حاصل کرنے میں متحیر ہیں اور ان عبارتوں کے دریاؤں میں غوطے لگانے والے بجائے موتی کے صرف سیپیوں پر قناعت کر رہے ہیں۔ میں حق کا اظہار کرنے میں شرماتا نہیں اور سچی بات کہتا ہوں کہ اُن کی باتیں جو عظیم اور بڑی ہیں ان کو وہی حاصل کر سکتا ہے جس نے خدا کے فضلِ عظیم سے حصہ پایا ہو اور خدا کے پاس سے قلب سلیم لے کر دنیا میں آیا ہو۔"[۴۵]

اسی طرح ہدایہ کی عبارت سہل ممتنع تھی جو مسائلِ فقہ بتانے کے ساتھ ساتھ دماغی ورزش کا سامان بھی مہیا کرتی تھی اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کو جلا دیتی تھی۔ اگرچہ اول الذکر دو کتابیں "کشاف" اور "بزدوی" عہد مغلیہ میں تقریباً خارج درس ہو گئی تھیں، مگر ان کی جگہ معقولات کی کتابوں کے جو اضافے ہوئے ان کا مقصد بھی یہی تھا کہ طلبا خود سوچیں اور دوسروں کی سوچی ہوئی باتوں کو سمجھنے لگیں۔

اس سلسلے میں آج ہمیں تعجب ہوتا ہے کہ اس درجے اعلیٰ تعلیم سے فارغ التحصیل ہونے کی عمر عموماً تیرہ چودہ سال سے بیس بائیس سال تک نظر آئے گی۔ مولانا غلام علی آزاد بلگرامی نے اپنی تصنیف "مآثر الکرام" میں سو ڈیڑھ سو سے اوپر علما کا تذکرہ کیا ہے اور ان کی اوسط عمر تحصیلِ علم قریب قریب یہی ہے۔ عہد اکبری کا ملک الشعرا اور عربی و فارسی کا ماہر عالم ابوالفیض فیضی چودہ سال کی عمر میں تحصیل علم سے فارغ ہوا[۴۶] ابوالفضل علامی نے پندرہ سال کی عمر میں علومِ معقول و منقول سے فراغت پائی[۴۷] مجدد الف ثانیؒ نے سترہ سال کی عمر میں علوم ظاہری کی تکمیل کی[۴۸] اسی سلسلے میں عبدالحق محدث دہلویؒ کا یہ بیان بھی قابلِ ذکر ہے کہ "لوگوں کے خیال سے بیس برس کی عمر میں فلسفہ، ادب اور فقہ و حدیث وغیرہ پڑھ چکا تھا اور اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس کے بعد ایک سال کچھ دنوں میں قرآنِ کریم بھی حفظ کیا"[۴۹] شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ جب میں نے اپنی زندگی کے چودہ مرحلے طے کر کے

---

[۴۵] مناظر احسن گیلانی، ہندوستان کے مسلمانوں کا نظامِ تعلیم و تربیت، جلد اول، ص ۳۰۸

[۴۶] رحمان علی، تذکرہ علمائے ہند، ص ۷۷

[۴۷] ایضاً ص ۷۸

[۴۸] ایضاً ص ۷۷

[۴۹] عبدالحق محدث دہلویؒ، اخبار الاخیار، ص ۵۱۱

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پندرھویں میں قدم رکھا تو والد بزرگوار کی انتہا درجے کی شفقت و مہربانی کی وجہ سے تمام متعلقہ فنون حاصل کر چکا تھا۔ محمد رحیم بخش اس ضمن میں تحریر کرتے ہیں کہ اسی سال حضرت شیخ عبدالرحیم صاحب نے آپ کے سر پر فضیلت کا عمامہ رکھا، علوم متعارفہ اور سلوک و تصوف کے درس کی اجازت دی اور دستار بندی کی رسم ادا کر کے آپ کی عمر و علم کی ترقی کی دُعا مانگی۔[۵۰]

دورِ مغلیہ میں نظامِ امتحان کی عدم موجودگی کی صورت میں کسی اہم درجۂ تعلیم کے فارغ التحصیل نوجوان کی دستار بندی کی جاتی تھی اور وہ اپنے استادِ محترم سے سندِ فضیلت پاتا اور جن جن کتابوں کا مطالعہ اس نے اپنے اُستاد کی زیر نگرانی کیا ہوتا اس سے متعلق طالبِ علم کو درسِ عام کی اجازت عطا کی جاتی جو اس بات کی سند تھی کہ اسے خاص درجے کی نصابی کتابوں پر مکمل عبور حاصل ہو گیا ہے، چنانچہ اس درجے تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد جو طلبا معلمی کو اپنا مقصدِ حیات بنانا چاہتے وہ اپنے اُستاد سے اجازت نامہ حاصل کر کے ذاتی طور پر درس و تدریس کا سلسلہ شروع کر دیتے۔ شاہ ولی اللہؒ کے والدِ بزرگوار شاہ عبدالرحیمؒ نے بھی خلیفہ ابوالقاسم اکبر آبادیؒ سے دینی فنون اور وہبی علوم کی تعلیم حاصل کر کے تحریری اجازت نامہ حاصل کیا اور دہلی میں اپنا مدرسہ جاری کیا۔[۵۱] خود شاہ ولی اللہؒ نے والد کے انتقال کے بعد اسی مدرسے میں سترہ سال کی عمر میں کتب دینیہ و عقلیہ کا درس دینا شروع کیا۔[۵۲] یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اس نصابِ تعلیم کو ختم کرنے والے حضرات اگر سرکاری ملازمت کے خواہش مند ہوتے تو قضا و افتا اور صدارت کے عہدوں پر فائز ہو جاتے تھے۔

زیرِ مطالعہ دور کے طریقۂ تعلیم اور طریقۂ تدریس کے چند دیگر امور بھی قابلِ ذکر ہیں۔ ابتدائی تعلیم سے اعلیٰ درجے کی تعلیم تک کوئی باضابطہ درجہ بندی نہ کی گئی تھی اور نہ طالبِ علم کے لیے موجودہ دور کی طرح درجہ بدرجہ تمام تدریسی مراحل سے گزرنا ضروری تھا، اور یہ بھی ضروری نہ تھا کہ مکتب کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ہی اعلیٰ تعلیم کے لیے کسی مدرسے یا درس گاہ سے وابستگی اختیار کی جائے۔ یہ ابتدائی تعلیم کسی بھی جگہ گھر پر یا شوقیہ پڑھانے والوں سے حاصل کی جا سکتی تھی۔ کیونکہ تعلیم کے خاص پیشہ ور اساتذہ کے سوا ہر شہر میں پڑھانے والے مل جاتے

---

۵۰ محمد رحیم بخش، حیاتِ ولی، ص ۴۰۸-۴۰۹

۵۱ ایضاً ص ۲۵۶

۵۲ ایضاً ص ۴۱۳

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہاں تک کہ سرکاری ملازم جن میں ملّا فتح اللہ شیرازی اور مولانا محمد مفتی جیسے عہدے دار شامل تھے، فرائض منصبی کے علاوہ پڑھنے پڑھانے کا کام بھی کرتے تھے۔ اس کے علاوہ گھروں میں بھی پڑھے لکھے والدین بچوں کو پڑھاتے تھے جیسے عبدالحق محدث دہلوی ؒ نے ابتدائی تعلیم اپنے والد صاحب سے گھر پر ہی حاصل کی۔ قرآن مجید ناظرہ پڑھا اور بوستان، گلستان، دیوانِ حافظ اور نظم کی مروجہ کتابیں والدِ محترم کی زیر نگرانی پڑھیں [۵۳] چونکہ ان کا مطمح نظر عربی کی اعلیٰ دینی تعلیم حاصل کرنا تھا اس لیے اس ابتدائی تعلیم کے بعد انھوں نے براہ راست اس کے حصول کی طرف توجہ دی۔ اُنھوں نے دہلی کے ایک مدرسے میں صبح اور دوپہر دو مرتبہ جانے کا ذکر کیا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ علوم عقلیہ و نقلیہ کی اعلیٰ تعلیم اُنھوں نے یہاں سے حاصل کی۔ ابتداءً فارسی کی تعلیم اُنھوں نے باقاعدگی سے حاصل نہ کی، کیونکہ مذکورہ بالا فارسی کتب کے علاوہ اپنے طالب علمی کے زمانے میں مزید فارسی کتابوں کے مطالعے کا ذکر نہیں کیا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ طلبہ مرحلہ وار تعلیم حاصل نہ کرتے تھے، بلکہ جن علوم و فنون کی تحصیل کی طرف ان کا طبعی رجحان ہوتا، معمولی ابتدائی تعلیم کے بعد اس کی تدریس شروع کر دی جاتی تھی۔ کوئی مضمون ان پر زبردستی نہیں ٹھونسا جاتا تھا۔ انھیں اپنی پسند کے مضامین انتخاب کرنے کی آزادی تھی اور وہ اپنے مستقبل کو نظر میں رکھتے ہوئے تعلیم حاصل کرتے، اس طرح وقت اور قابلیت کا ضیاع نہیں ہوتا تھا۔ گویا ابتدائی تعلیم گھر یا مکتب میں حاصل کرنے کے بعد انھیں آزادی تھی کہ فارسی کا اعلیٰ نصاب پڑھنے کے بعد اپنی شعر و ادب کی صلاحیتوں کو اُجاگر کریں یا ابوالفضل کا بیان کردہ سرکاری نصاب کا درس حاصل کر کے تمام علوم مروجہ پر عبور حاصل کریں یا پھر عربی کے علوم عقلیہ و نقلیہ کے مروجہ نصاب درس میں شریک ہو جائیں۔ چنانچہ اس نظامِ تعلیم کے حصول کا انحصار طالبانِ علم کے ذاتی شوق پر تھا، اور اُنھیں کسی خاص مرحلے تک مخصوص نصاب تعلیم کا مطالعہ کر کے ذاتی پسند و ناپسند کا میدان اختیار کرنے کی پابندی نہ تھی۔ یہی وجہ تھی کہ طلبا کے وقت کا زیاں نہ ہوتا اور فارغ التحصیل ہونے کی اوسط عمر بہت کم ہوتی۔

اس طریقہء تعلیم کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ تدریسی مراحل کی درجہ بندی نہ تھی بلکہ طالب علم کی قابلیت کا اندازہ اس امر سے کیا جاتا تھا کہ اس نے متعلقہ علوم کی کن کن کتابوں میں درک حاصل کر لیا ہے، اس طرح یہ درس گاہیں جماعت بندی کی قید سے بھی آزاد تھیں۔" عموماً ایک ایک مدرس یا اُستاد کے پاس پانچ سے زیادہ طلبا کی

---

۵۳ عبدالحق محدث دہلوی، اخبار الاخیار، ص ۵۱۰

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جماعت نہیں تھی، بلکہ بسا اوقات تین چار ہی ایک ساتھ پڑھا کرتے تھے"[۵۴] ملا عبد الحکیم سیالکوٹی کا ایک شاگرد سید میر اسمٰعیل جو پہلے دوسرے شاگردوں کے ساتھ مل کر آپ کے درس کی سماعت کرتا تھا، اسے بعد ازاں ملا صاحب نے عصر اور مغرب کے درمیان علیحدہ پڑھنے کا وقت دے دیا[۵۵] اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اساتذہ کا عام رجحان یہ ہوتا تھا کہ وہ طلبا پر انفرادی توجہ دیں اور دورانِ درس و تدریس درپیش مسائل اور مشکلات کو بحث و مباحثے سے حل کریں۔ درس و تدریس کے اس طریقۂ تعلیم کا بڑا فائدہ یہ تھا کہ طلبا کو اپنی دماغی صلاحیتوں کے مطابق پوری آزادی کے ساتھ آگے بڑھنے کا موقع مل جاتا تھا اور ذہین طلبا متوسط درجے کے طلبا سے پہلے اپنا مقررہ نصاب ختم کر لیتے تھے۔

عہد مغلیہ کے طریقۂ تعلیم میں موجودہ دور کی طرح امتحانات نہیں لیے جاتے تھے۔ عہدِ مغلیہ میں صرف اورنگ زیب کے دور میں ایک واقعہ ملتا ہے کہ بوہروں کی تعلیم کو لازمی اور جبری بنانے کے ساتھ ساتھ ماہانہ امتحانات کا طریقہ رائج کیا گیا جس کے نتیجے کی اطلاع بادشاہ کو دی جاتی تھی۔[۵۶] ورنہ عہد مغلیہ کی یہ خصوصیت ہے کہ اس میں تعلیم کو مکمل آزاد رکھا گیا تھا، اس لیے تعلیمی اداروں میں سرکاری امتحانات کا تصور ہی نہ تھا، مگر مدرسین اور اساتذہ کا بھی درس گاہوں اور مدرسوں میں طلبا سے باضابطہ امتحان لینے کا کوئی رجحان نہیں تھا، بلکہ چند دوسرے ایسے طریقے اختیار کیے گئے تھے جس سے طلبا کی آزمائش ممکن تھی۔ مکاتب میں بچوں کو پڑھائے گئے اسباق کا آموختہ سن لینا ہی کافی سمجھا جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ ابوالفضل نے آئینِ اکبری میں مکتب کے استاد کی توجہ جن امور پر مرکوز رکھنے کا ذکر کیا ہے اس میں آموختہ کو بھی اہمیت دی ہے۔[۵۷] کیونکہ اس سے بچوں کا سبق روز بروز پختہ ہو جاتا ہے اور اُستاد بھی اُن کی ترقی سے باخبر رہتا ہے۔ مگر مدارس میں درسِ نصاب کا مقصد حافظے کی ترقی نہ تھی، بلکہ طالب علم میں خود سوچنے اور دوسرے مصنفین کی سوچی ہوئی باتوں کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا کرنا تھا، چنانچہ

---

۵۴ مناظر احسن گیلانی، ہندوستان میں مسلمانوں کا نظامِ تعلیم و تربیت، جلد دوم، ص ۱۱

۵۵ غلام علی آزاد بلگرامی، مآثر الکرام، ص ۲۳۳

۵۶ علی محمد خاں، مرأت احمدی بحوالہ نربندر ناتھ لا، عہد اسلامی میں تعلیمی ترقی، ترجمہ، اخلاق حسین زبیری، سلطان فاطمہ بلخی (کراچی؛ اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ ۱۹۶۵ء) ص ۲۰۲

۵۷ ابوالفضل، آئینِ اکبری، جلد اول، ص ۲۱۸

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مطالعہ، مباحثہ، اعادہ اور فراغت سے پہلے مدرسہ یعنی بڑے طالب علموں کا چھوٹوں کو پڑھانا وہ طریقۂ کار تھا جس کے ذریعے استاد طالب علموں کی بڑھتی ہوئی قابلیت کو ساتھ ساتھ جانچتا رہتا۔ عبدالحق محدث دہلویؒ نے اس کا ذکر یوں کیا ہے: "مطالعۂ کتب، بحث و تکرار، اعادۂ اسباق، شرح و حواشی کے معائنہ میں اپنا پورا وقت صرف کرتا" [۵۸]

چنانچہ سب سے پہلے طالب علم میں خود مطالعہ کا رجحان پیدا کیا جاتا۔ عبدالحق محدث دہلویؒ اگرچہ بطور طالب علم اپنے عہد کا مثالی نمونہ تھے مگر "اخبار الاخیار" میں انھوں نے زمانۂ طالب علمی کا جو حال لکھا ہے اور ذوقِ مطالعہ کا جو ذکر کیا ہے اس سے اس طریقۂ کار اور طریقۂ تعلیم پر روشنی پڑتی ہے، لکھتے ہیں:

"میرے ہاتھ جو کتاب پڑتی، میں اس کے اول سے آخر کا لحاظ کیے بغیر اسے کھول کر اخیر تک پڑھ لیا کرتا۔ مطالعہ کو وقت کا تقاضا اور ضروری لازمہ سمجھتا کیونکہ علم حاصل کرنا میرا نصب العین تھا۔" [۵۹]

اس سلسلے میں مزید لکھتے ہیں:

"پڑھتے پڑھتے جب رات کے بارہ بج جاتے تو والد ماجد فرماتے بابا کیا کر رہے ہو؟ تو فوراً ہی لیٹ جاتا تاکہ جھوٹ نہ کہوں اور پھر عرض کرتا جی میں سو رہا ہوں، فرمائیے کیا حکم ہے؟ اس کے بعد پھر اُٹھ کر پڑھنے لگتا۔ اکثر اوقات ایسا ہوا کہ چراغ کی لو سے میرے صافہ اور سر کے بالوں میں آگ لگ گئی اور مجھے اس وقت پتا چلا جب حرارت میرے دماغ پر پہنچی۔" [۶۰]

زمانۂ طالبِ علمی کے کثرتِ مطالعہ کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"علمِ نحو میں "کافیہ"، "لب الالباب" اور "ارشاد" وغیرہ کے بعض اوقات ایک نشست میں سولہ سولہ صفحے پڑھ جاتا اور شوق کا یہ حال تھا کہ جب کوئی کتاب حاشیہ والی مل جاتی تو اسے استاد سے نہ پڑھتا بلکہ اکثر اوقات اسے خود ہی پڑھ کر سمجھ لیتا۔ ہاں

---

۵۸ عبدالحق محدث دہلویؒ، اخبار الاخیار، ص ۵۱۲

۵۹ ایضاً ص ۵۱۱

۶۰ ایضاً ص ۵۱۲

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اگر کوئی مشکل باب ہوتا تو اُسے لازماً استاد کے روبرو پڑھ کر سمجھتا تھا۔"[٦١]

اس طریقۂ تدریس کا فائدہ یہ تھا کہ طالب علم دورانِ درس یا بعد درس زیرِ مطالعہ موضوع پر استاد سے بحث کرتے تاکہ اندازہ ہو کہ اُنھوں نے مسئلے کو کس قدر سمجھ لیا ہے۔ اساتذہ اس کی توقع بھی رکھتے تھے کہ طلبا اعتراض یا سوال کریں تاکہ اُن کی قابلیت کا اندازہ لگایا جا سکے اور ذہنی ترقی کو جانچا جا سکے۔ یہی وجہ ہے کہ ملّا عبدالحکیم سیالکوٹی اپنے حلقۂ درس میں ایک نووارد شاگرد میر سید اسمٰعیل بلگرامی کے چپ چاپ بیٹھے رہنے پر اُن کی خاموشی کا سبب دریافت کرتے ہیں اور بعد ازاں جب وہ اس طالب علم کو علیحدہ پڑھانے کے لیے عصر اور مغرب کے درمیان کا وقت دیتے ہیں تو دوران سبق بحث و مباحثہ کو خصوصی اہمیت دی جاتی ہے، یہاں تک ایک مرتبہ بحث و تحقیق کا یہ سلسلہ تین دن تک برابر جاری رہتا ہے کہ بالآخر طالب علم متنازعہ مسئلے پر اپنی ذاتی تحریر پیش کرتا ہے۔[٦٢]

اس واقعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ بحث و تحقیق کے اس طریقۂ درس سے استاد کو اپنے شاگرد کی قابلیت کا پتا چلتا رہتا تھا، سوالات میں گہرائی جتنی زیادہ بڑھتی جاتی، سمجھا جاتا کہ وہ کس حد تک علم میں ترقی کر رہا ہے۔ قرأت اور اعادہ کے ذریعے بھی طالب علموں کے ذہنوں کو متحرک رکھا جاتا جس سے خصوصاً ذہین اور قابل شاگردوں کو اُبھرنے کا موقع ملتا۔ شاہ ولی اللہؒ نے اپنے والدِ محترم سے جن کتابوں کا درس لیا ان میں سے ایک کے متعلق لکھتے ہیں:

"شمائل النبیؐ، یہ کتاب اوّل سے آخر تک طالب علموں کے ایک بڑے حلقے میں پڑھی، گو اس میں چند فاضل بھی شریک تھے مگر قرأت میری ہی تھی۔"[٦٣]

اسی طرح کسی قابل شاگرد کو اجازت تھی کہ وہ اُستاد کا پڑھایا ہوا درس طلبا کو اپنے طور پر سمجھائے اور اس کا اعادہ کرے۔ اہلِ عرب میں اس منصب کا حامل طالبِ علم "معید" کہلاتا تھا۔[٦٤] ہندوستان میں بھی

---

٦١ عبدالحق محدث دہلویؒ، اخبار الاخیار، ص ۵۱۱

٦٢ غلام علی آزاد بلگرامی، مآثر الکرام ص ۲۳۳ - ۲۳۴

٦٣ محمد رحیم بخش، حیات ولی، ص ۱۰۱

٦٤ شبلی نعمانی، الغزالی (لکھنؤ، اصح المطابع آسی پریس، ۱۹۰۱ء) ص ۱۱

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہی نام استعمال کیا جاتا تھا ۔

اس طریقۂ تعلیم کی آخری کڑی یہ تھی کہ بڑی جماعت کے طلبا یعنی اعلیٰ تعلیم کی کتابیں پڑھنے والے فارغ ہونے سے پہلے اپنی پڑھی ہوئی کتابیں نچلی جماعت تک طلبا کو پڑھاتے تھے ۔ اگرچہ عہد مغلیہ میں کوئی واقعہ بطور مثال پیش نہیں کیا جا سکتا مگر اس کے فوراً بعد جب یہی نظامِ تعلیم رائج تھا مولانا عبدالحی فرنگی محلی نے اپنی سوانح عمری "نفع المفتی والسائل"[۶۵] میں اور مولانا غلام علی آزاد بلگرامی نے "مآثر الکرام" میں اس طریقۂ کار کی ذاتی امثال سے نشان دہی کی ہے ۔

الغرض امتحانی نظام کی عدم موجودگی میں اساتذہ مختلف عوامل سے طلبا کی ذہنی ترقی کی جانچ پڑتال کرتے رہتے اور ان میں خود سوچنے ، مفکرین کی سوچی ہوئی باتوں کو سمجھنے اور پھر دوسروں کو سمجھانے کی صلاحیت پیدا کرتے تھے اور یہی اس دور کے نظامِ تعلیم کا اصل جوہر تھا ۔

---

۶۵ مناظر احسن گیلانی ، ہندوستان میں مسلمانوں کا نظامِ تعلیم و تربیت ، جلد اول ۔ ص ۳۲۳

© rasailojaraid.com